شمس

سورہ نمبر 91

تنزیلی نمبر 7

آیات 15

پارہ 30

مکی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورہ شمس

تعارفی نوٹ

1. نام" :الشمس" (سورج)۔
   یہ نام پہلی آیت کے لفظ **"والشمس"** سے لیا گیا ہے۔

2. مکی/مدنی **:مکی** سورت ہے۔

3. آیات: **15**

4. مرکزی موضوع:
   انسان کی کامیابی اور ناکامی کا مدار اس بات پر ہے کہ وہ اپنے نفس کو پاکیزہ کرتا ہے یا آلودہ۔

5. ساختی ترتیب:
   - ابتدائی 7 آیات میں اللہ تعالیٰ نے مختلف کائناتی نشانیوں کی قسم کھائی۔
   - اگلی آیات میں انسان کے نفس اور اس کی پاکی و ناپاکی کا ذکر ہے۔
   - آخر میں ثمود کی مثال کے ذریعے بتایا گیا کہ جس نے نفس کو آلودہ کیا وہ تباہ ہوا۔

6. اہم اسلوب:
   قرآن کی **سب سے زیادہ قسمیں** ایک ساتھ اسی سورت میں آئی ہیں۔

7. بنیادی پیغام:
   نفس کی تزکیہ ہی فلاح ہے، اور اس کی گندگی ہی ہلاکت ہے۔

فضیلت سورہ شمس

📖 امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ مستحب ہے اس شخص کے لیے جس کے رزق میں کمی ہو، جس کا نقصان زیادہ ہو جو حسرتوں میں مبتلا رہتا ہو کہ وہ پابندی کے ساتھ یہ سورت پڑھے اس کا رزق بڑھے گا اور اس کی توفیق میں اضافہ ہوگا اور جو اس سورے کا پانی پیے گا تو حکم خدا سے بے قراری کو قرار آجائے گا۔ (خصوصیات و فوائد قرآن)

📖 حدیث نبویؐ ہے: جو شخص توفیق سے محروم ہے اس شخص کو چاہیے کہ وہ سورہ شمس کو زیادہ سے زیادہ پڑھے تو اس کی توفیق میں اضافہ ہوجائے گا۔ وہ جہاں بھی جائے گا، نفع مند ہوگا۔ اس کا حافظہ زیادہ ہوگا، وہ لوگوں میں ہردلعزیز ہوگا اور اس کے مراتب میں اضافہ ہوگا۔ (نورالثقلین)

📖 کتاب ثواب الاعمال میں ہے: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص سورہ الشمس، اللیل، الضحیٰ، الم نشرح کو دن یا رات میں پڑھے تو کائنات کی ہر موجود چیز، حتٰی کہ اس کا اپنا گوشت پوست قیامت کے دن اس کے حق میں گواہی دے گا اور اللہ ان کی گواہی کو قبول کرتے ہوئے حکم دے گا کہ میرے بندہ کو جنت میں لے جاؤ تاکہ وہ جس جنت کو چاہے اپنے لیے اختیار کرے۔ (نورالثقلین)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص سورہ شمس کو پڑھے گا گویا اس نے ان تمام چیزوں کی تعداد میں جن پر سورج اور چاند طلوع کرتے ہیں، صدقہ دیا ہے۔ (نمونہ)

یہ قرآن کی وہ سورۃ ہے جس میں سب سے زیادہ (11) قسمیں کھائی گئی ہیں۔

وقت نزول

شروع کی پانچ سورتوں کے نزول کے بعد، غالبا ایسی سورتیں نازل ہوئی ہوں گی، جس میں صرف آیاتِ الٰہی کا ذکر ہو، او کوئی دوسرا خاص ٹاپک نہ ہو۔ ان میں سورہ اعلٰی، شمس و لیل ہوسکتی۔ یعنی یہ قران کے نزول کے بہت ابتدائی سورتوں میں سے ایک ہے۔

قسم ہے

1۔ وَ الشَّمۡسِ وَ ضُحٰہَا ۪﴿۱﴾

قسم ہے سورج اور اس کی روشنی کی۔
(بلاغ القرآن)

سورج اور چاند کی تخلیق
هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا
"وہی ہے جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو نور بنایا"
(یونس، 10:5)

سورج کا مقررہ نظام
وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا
"اور سورج اپنے ایک ٹھکانے کی طرف چل رہا ہے"
(یٰس، 36:38)

کائنات کی آیات
سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ
"ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور ان کے اپنے نفسوں میں بھی"
(فصلت، 41:53)

سورج زندگی کا سب سے بڑا منبع ہے۔ اس کے بغیر زمین پر کوئی زندگی باقی نہ رہ سکے۔ اسی طرح **وحی اور ہدایت** انسان کی **روحانی زندگی کا سورج** ہے۔ جیسے سورج کی روشنی اندھیروں کو ختم کرتی ہے، ایسے ہی وحی دل کے اندھیروں کو مٹاتی ہے۔

اعتراض: اللہ کو اپنی بات منوانے کے لیے قسم کھانے کی ضرورت کیوں؟
جواب: اللہ کے لیے قسم کھانا انسانی سمجھ بوجھ کے لیے ہے۔ چونکہ انسان کائناتی نشانیوں سے زیادہ مانوس ہے، اس لیے اللہ ان کے ذریعے اپنی بات کو مؤکد کرتا ہے۔

جس طرح سورج روشنی و توانائی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اسی طرح ہدایت انسان کی فکری توانائی کا ذریعہ ہے۔
سائنسی دور میں سورج توانائی (Solar Energy) کی بنیاد ہے، یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اللہ کی نشانیاں آج بھی انسان کے لیے عملی سبق رکھتی ہیں۔

جس طرح سورج کے بغیر دنیا اندھیرے میں ڈوب جاتی ہے، اسی طرح ہدایت کے بغیر انسان کی زندگی اندھیرے میں ہے۔

2۔ وَ الۡقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ﴿۲﴾

اور قسم ہے چاند کی جب پیچھے آئے۔

(اظھر)

چاند کی منازل

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ

"اور ہم نے چاند کے لیے منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی شاخ کی مانند ہو جاتا ہے"

(یٰس، 36:39)

سورج اور چاند کی تابعیت

لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ

"نہ سورج کے بس میں ہے کہ چاند کو پکڑ لے اور نہ رات دن سے آگے نکل سکتی ہے"

(یٰس، 36:40)

چاند کی روشنی

وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا

"اور اللہ نے ان میں چاند کو نور بنایا اور سورج کو چراغ"

(نوح، 71:16)

لغوی و صرفی تحقیق

- **قمر**: چاند، اس کے لغوی معنی ہیں "چمکنے والی چیز"۔
- **تلا** (یَتلو، تَلْوًا): پیچھے آنے، پیروی کرنے کے لیے آتا ہے۔ قرآن کی تلاوت بھی اسی سے ہے (یعنی ایک کے پیچھے دوسرا لفظ لانا)۔
- **ھا** (ضمیر): سورج کی طرف اشارہ ہے

راغب*(راغب) نے کہا ہے کہ تَلَا کے معنی ہیں کسی کے پیچھے اس طرح چلنا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی غیر حائل نہ ہو۔ یہ شکل کبھی تو جسمانی طور پر ہوتی ہے اور کبھی حکم کا اقتداء کرنے میں۔ اور ان معانی میں اس کا مصدر تُلُوٌّ و تِلْوٌآتا ہے۔ کبھی اس کے

معنی پڑھنے اور غور و تدبر کرنے کے ہوتے ہیں تو اس کا مصدر تِلَاوَۃٌ آتا ہے۔ (لغت القرآن)

📖 تلاوت: اتباع احکام کے لیے تِلاوت قرآن کا حکم موجود ہے۔ راغب کے نزدیک تَلاَوَۃٌ بالخصوص خدا کی طرف سے نازل شدہ کتابوں کے اتباع کو کہتے ہیں۔ چونکہ اس اتباع کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ان احکام کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے اس لیے انہیں اس طرح پڑھنے کو بھی تلاوۃٌ کہتے ہیں۔ لیکن یہ لفظ قَرِأۃٌ (پڑھنے) سے خاص ہے۔ یعنی قَرأۃٌ (پڑھنا) بہر حال تلاوۃ کے اندر آجاتا ہے لیکن تلاوۃ (اتباع کرنا) قِراۃٌ کے اندر نہیں آتا**(راغب)۔ لہٰذا تلاوت قرآن کریم کے معنی ہیں قرآن پر عمل کرنے کے لیے اسے پڑھنا (نہ صرف پڑھتے رہنا)۔ (لغت القرآن)

📖 سلیمان دیلمی نے کہا کہ میں نے ابوعبداللہ علیہ السلام سے پوچھا **والشمس وضحها** کا کیا مطلب ہے؟

فرمایا اس سے رسول اللہؐ مراد ہیں، لوگوں کا دین ان کے لئے واضح کیا۔

پوچھا **والقمر اذا تلاها** کا کیا مطب؟ فرمایا اس ے مراد علی علیہ السلام ہیں، جو رسول اللہؐ کے تالی (پیچھے چلنے والے) ہیں، رسول اللہ نے علم کو علیؑ میں بھردیا۔

پوچھا **والنهار اذا جلاها** کا کیا مطلب؟ فرمایا اس سے فاطمہؑ کی اولاد سے امام مراد ہیں۔ (تفسیر فرات کوفی)

📖 روضہ کافی میں ہے: "الشمس" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ راوی نے عرض کیا: والقمر اذا تلاها۔ کی تفسیر کیا ہے؟

آپؑ نے فرمایا: "قمر" حضرت امیرالمومنین علیہ علیہ السلام ہیں۔
(تفسیر نورالثقلین)

پہلی آیت میں سورج کی قسم آئی تھی، دوسری آیت میں چاند کی۔
اس ترتیب کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح کائنات میں سورج اصل روشنی کا منبع ہے اور چاند اس کا پیروکار ہے، ویسے ہی انسان کی ہدایت براہِ راست وحی سے ہے، اور باقی سب اسی کے تابع ہیں۔
اس تدریج سے قرآن انسان کو "اصل اور تابع" کی نسبت سمجھا رہا ہے۔

3۔ وَ النَّہَارِ اِذَا جَلّٰہَا ۪﴿۳﴾

قسم ہے دن کی جب اسکو ظاہر کردے۔
(اظھر)

دن کا روشن ہونا
وَآيَةٌ لَّهُمُ اللَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَإِذَا هُم مُّظْلِمُونَ
"اور ان کے لیے ایک نشانی رات ہے، ہم اس میں سے دن کو کھینچ لیتے ہیں تو وہ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں"
(یٰس، 36:37)

دن بطور نشانی
وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا
"اور ہم نے دن کو معاش کا وقت بنایا"
(الفرقان، 25:47)

روشنی اور تاریکی کا تناسب
وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ
"اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا"
(بنی اسرائیل، 17:12)

جَلْوٌ کے اصل معنی ظاہر طور پر کھول دینے کے آتے ہیں(راغب)۔**
(لغت)

نَهَار :دن، روشنی کا وقت۔
جلّی (يُجَلِّي): ظاہر کرنا، کھول دینا، نمایاں کرنا۔
ها (ضمیر): سورج کی طرف اشارہ ہے، یعنی دن سورج کو نمایاں کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو diurnal مخلوق بنایا ہے، جس کی آنکھیں صرف دن میں صحیح طرح سے دیکھ سکتی ہیں. اور رات انسان کے لیے آرام کے لیے بنائی ہے.
دن ایسی چیز ہے جس میں ہر چیز کھل کر سامنے آجاتی ہے. ہر چیز کو انسان واضح طور پر دیکھ سکتا ہے.

اکثر مترجمین نے ضمیر "ہا" کا ترجمہ سورج کی مناسبت سے کیا ہے، کیونکہ سورہ کی شروعات "شمس" سے ہوتی ہے.
"قسم ہے دن کی جب سورج کو نمایاں کرے" (جوناگڑھی)
"اور قسم ہے دن کی جب وہ اس (سورج) کو روشن کردیتا ہے." (اسرار)

ظاہر ہے کہ منطقی طور پر تو یہ غلط ہے. دن سورج کو روشن نہیں کرتا. بلکہ الٹا سورج دن کو روشن کرتا ہے... بلکہ اصل میں سورج کی وجہ سے روشنی پھیلتی ہے جسے ہم "دن" کہتے.
پر ہاں اس کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ "دن کی روشنی میں سورج نمودار ہوجاتا ہے، ظاہر ہوجاتا ہے." یعنی وہ دن کا وقت ہوتا ہے جب سورج ظاہر ہوتا، نکل آتا ہے. یعنیرات وہ وقت ہوتا ہے جب چاند ظاہر ہوتا ہے، اور دن وہ وقت ہوتا ہے جب سورج ظاہر ہوتا ہے.

✏ دوسرا خیال یہ بھی ہوسکتا کہ "ہا" کی ضمیر "دن" کی طرف ہے، کہ دن نکلتا ہے تو ہر چیز "ظاہر" ہوجاتی ہے، یعنی انسان کے perspective سے دن میں اُسے ہر چیز واضح نظر آنا شروع ہوجاتی۔

جبکہ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اس سورۃ میں "ہا" ایک rhyming word (منظومی لفظ) بھی ہوسکتا ہے، جو کہ اکثر مکی سورتوں کا انداز بھی ہے۔ اور اگر اس "ہا" سے سورج ہی مراد لیا جائے تو یہ ضمیر اس سورہ کی ہر آیت کے آخر میں آتی ہے، پھر ہر آیت میں اس سے مراد سورج لینا چاہیے۔ جو کہ ناممکن ہے۔

یعنی آیت 5 سے ہی، اس ضمیر "ہا" کا دوسرا کوئی معنی لینا پڑ جاتا ہے، کیونکہ ہر جگہ "سورج" فٹ نہیں بھیٹتا۔

✏ آیت نمبر 2 میں، یہی منطق استعمال کرتے ہوئے اگر 'ہا' سے سورج مراد لیا جائے اور ترجمہ کیا جائے گا، چاند کی قسم جو سورج کے پیچھے آئے۔ تو:

عرفہ عام میں زمینی اعتبار سے ایسا لگتا ہے۔

(اور یہ مفہوم "عرفہ عام" کو مدنظر رکھتے ہوئے درست بھی ہے)

پر حقیقت کی نگاہ سے (موجودہ جدید سائنس کے انکشافات کی روشنی میں) دیکھا جائے تو پھر ایسا exactly نہیں ہوتا۔

1. یعنی فلکیاتی اعتبار سے سورج، چاند کا آپس میں کوئی مقابلہ نہیں، کہ ایک دوسرے کے بعد آتا ہو۔ سورج ستارہ ہے، اور چاند

ایک سیٹلائیٹ ہے۔ یعنی تابع کا بھی تابع ہے۔(جیسا مفسر کوثر نے بیان کیا)

2. **زمینی اعتبار سے بھی، exactly ایسا نہیں ہوتا کہ سورج جائے تو چاند آئے۔ بلکہ کئی بار دن کو بھی چاند ظاہر ہوتا ہے، اور کئی بار رات کو (اماوس کی راتوں میں) چاند رات کو بھی نہیں نکلتا۔ اسی وجہ سے مترجمین و مفسرین کو تاویل کرنی پڑی کہ صرف چودھویں کے چاند کی بات ہورہی۔**

اس لیے ان آیات کا مفہوم حقیقت میں سائنس سمجھانا نہیں، بلکہ اللہ کی قدرتوں کی طرف اشارہ ہے، سورج، چاند، دن، رات... جو اپنے "قدر" کے مطابق چل رہے ہیں۔

دن انسانی زندگی کے لیے **عمل اور معاش** کا وقت ہے، یہ ہمیں سبق دیتا ہے کہ زندگی بھی محدود وقت ہے جس میں **عمل کرنا ضروری** ہے۔
جس طرح دن سورج کو واضح کرتا ہے، ایسے ہی اللہ کی ہدایت انسان کے باطن کو واضح کرتی ہے۔

پہلی آیت میں **سورج**، دوسری میں **چاند**، اور اب تیسری میں **دن** کا ذکر ہے۔
یہ تدریج "**روشنی ← انعکاس ← اظہار**" کو ظاہر کرتی ہے۔
یعنی پہلے سورج کی اصل روشنی، پھر چاند کا انعکاس، اور پھر دن کا اس کو ظاہر کر دینا ← تاکہ انسانی عقل کو یاد دلایا جائے کہ ہدایت بھی اسی طرح مختلف درجوں میں دل تک پہنچتی ہے۔

کہ پہلے **وحی کی روشنی کو قبول** کرنا ← پھر اس روشنی کا تمہاری **"عمل" سے منعکس ہونا** ← اور **زبان سے اسکا اظہار ہونا۔**

4۔ وَ الَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰہَا ﴿۴﴾

اور رات کی قسم جب وہ اس پر چھا جائے۔

(اظھر)

رات کا ڈھانپنا

يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا

"وہ رات کو دن پر لپیٹ دیتا ہے، جو تیزی سے اس کے پیچھے آتا ہے"

(الاعراف، 7:54)

اندھیرا بطور پردہ

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا

"اور ہم نے رات کو پردہ بنایا"

(النبأ، 78:10)

- لفظ "غشّی ہم سورہ نجم میں پڑھ کے آئے، ایک بار سدرۃ المنتھیٰ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا (آیت 16)، اور ایک بار پھر اُسی سورہ (آیت 54) میں آتا ہے، حضرت لوطؑ کی قوم کے تباہی کے بعد، فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰىۚ - پھر اس پر چھا دیا جو چھا دیا۔ یعنی چھا جانے ، ڈھاپنا، چھپا دینا کے مفہوم میں ہے عموماً۔ یہاں بھی اسی مفہوم میں، رات چھا جاتی ہے، ڈھانپ لیتی ہے، چیزوں کو چھپا دیتے ہے اسی مفہوم میں ہے۔

- یہاں بھی اکثر مترجمین کا ترجمہ یہی ہے کہ رات کی قسم جب سورج کو چھپا دے۔ اگر تمثیلی انداز میں بولا جارہا تو پھر ایک بات ہے۔ اس سے وہ زمینی تناظر والا پہلو زیادہ قوی ہے۔

- آیات 2 سے 4 تک اگر ضمیر "ہا" سے سورج ہی مراد لیا جائے تو تینوں آیتوں کا مفہوم زمینی تناظر میں لینا پڑے گا۔ کیونکہ ہزاروں

سالوں سے لوگ ان چیزوں کو اسی طرح مشاہدہ کرتے تھے، اور ان آیات میں بھی اللہ کی قدرتوں کی طرف اشارہ ہے، نہ کہ سائنس کی باریک بینی سمجھانا۔

دوسری جانب: اگر بالفرض، ضمیر "ہا" سے سورج مراد نہ لیا جائے، تو یہ معنیٰ بھی ہوسکتی کہ رات چیزوں کو چھپا دیتی ہے۔ یعنی دن ہر چیز کو ظاہر کردیتا ہے، تو رات ہر چیز کو ڈھانپ لیتے ہے، یعنی اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں۔

جیسے رات چھپا لیتی ہے اور ہر چیز اندھیرے میں ڈوب جاتی ہے، اسی طرح اگر وحی کی روشنی دل سے چھپ جائے تو انسان روحانی تاریکی میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ آیت انسان کو یاد دلاتی ہے کہ روشنی اور اندھیرے کا یہ تغیر محض سائنسی نہیں، بلکہ سبق آموز حقیقت ہے۔

? **اعتراض:** رات تو خود سورج کو ڈھانپتی نہیں، بلکہ زمین اپنی گردش سے اندھیرا پیدا کرتی ہے؟

☑ **جواب: قرآن عوامی فہم کے مطابق بیان کرتا ہے۔ عام انسان کو یہی نظر آتا ہے کہ رات سورج کو چھپا لیتی ہے۔ یہ بیانیہ سادہ فہم اور اثر انگیزی کے لیے ہے، سائنسی حقیقت کے خلاف نہیں۔**

سنی / شیعہ تفسیری اختلاف

- **اہل سنت مفسرین** :اسے رات کے تغیر و تبدل کی قسم مانتے ہیں۔
- **اہل تشیع مفسرین** :بعض باطنی تفاسیر میں "لیل" کو باطل یا ظلمت، اور "شمس" کو نورِ نبوت قرار دیا گیا ہے۔ لیکن وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ظاہری تفسیر یہی ہے کہ رات سورج کو ڈھانپ لیتی ہے۔
- دونوں مکاتب فکر کا مقصد ایک ہی ہے: قسموں کے ذریعے اصل مضمون (نفس کی فلاح و ہلاکت) پر تاکید۔

وما

5۔ وَ السَّمَآءِ وَ مَا بَنٰهَا ﴿۵﴾

اور آسمان کی قسم اور جیسا کہ اسے بنایا۔
(اظھر)

آسمان کی مضبوطی
وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ
"اور ہم نے آسمان کو قوت سے بنایا اور ہم وسعت دینے والے ہیں"
(الذاریات، 51:47)

آسمان بغیر ستون کے
خَلَقَ السَّمَاوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا
"اس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے پیدا کیا جو تمہیں نظر آئیں"
(لقمان، 31:10)

آسمان کا استحکام
اللَّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَاوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ
"اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے بلند کیا جو تم دیکھتے ہو"
(الرعد، 13:2)

✎ **یہاں سے مفسرین کے درمیان، ضمیر "ہا" کے دو طرح سے ترجمہ کیا گیا ہے، یا "جیسا کہ اس کو" بنایا، یا "جس نے اس کو" بنایا۔ (وضاحت آنے والی آیتوں میں پیش کی جارہی۔)**

آسمان **انسان کے اوپر ایک محفوظ چھت** کی مانند ہے۔ قرآن بار بار یاد دلاتا ہے کہ یہ **سب کچھ کسی حکیم و علیم خالق نے بنایا ہے**۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے آسمان کی تعمیر کو اپنی قدرت کی سب سے بڑی دلیل کے طور پر پیش کیا۔ **جیسے آسمان قائم ہے، ایسے ہی اللہ کا قانون اور سنت بھی قائم ہے۔**

آج کی جدید فلکیات ہمیں بتاتی ہے کہ **کائنات ایک عظیم "Cosmic Order"** پر قائم ہے۔ یہ قرآن کے اس بیان کی سچائی ہے کہ **آسمان کسی حادثے کا نتیجہ نہیں بلکہ تعمیر کیا گیا ہے۔**

6۔ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا طَحٰہَا ۪ۙ﴿۶﴾

اور زمین کی قسم اور جیسا کہ اس کو پھیلایا۔

(اظھر)

زمین کو بچھانا
وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا
"اور اللہ نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا"
(البقرة، 2:22)

زمین کی پیدائش اور پھیلاؤ
وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا
"اور زمین کو اس کے بعد پھیلا دیا"
(النازعات، 79:30)

زمین کو سکون گاہ بنانا
أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا
"کیا ہم نے زمین کو گھوارہ نہیں بنایا؟"
(النبأ، 78:6)

زمین وہ جگہ ہے جسے اللہ نے انسان کے لیے مسکن بنایا۔ اگر یہ زمین نا ہموار یا زندگی کے لیے ناقابلِ استعمال ہوتی تو انسان کی بقا ممکن نہ تھی۔ یہ اللہ کی قدرت اور رحمت ہے کہ زمین کو ایک متوازن اور بچھونے کی طرح بنایا تاکہ زندگی قائم ہو سکے۔

اعتراض: قرآن کہتا ہے زمین "بچھائی گئی" یا "پھیلائی گئی"، جبکہ سائنس کے مطابق زمین گول ہے؟

جواب: "طحو" یا "دحو" کے معنی زمین کو رہنے کے قابل بنانے، ہموار کرنے اور پھیلانے کے ہیں۔ یہ الفاظ سادہ انسانی تجربے کے مطابق ہیں (کہ زمین انسان کو بچھونے کی طرح نظر آتی ہے)، اور سائنسی حقیقت کے منافی نہیں۔

یہاں "زمین" سے مراد پلانیٹ ارتھ کی خشکی کا حصہ ہے جہاں انسان رہتا ہے۔ (جیسا کہ اردو میں بھی لفظ "زمین" ایک پلانیٹ کے لیے استعمال ہوتا، پر اصل میں "زمین" خشکی کے حصہ کو کہا جاتا۔)

زمین کو پھیلا دیا، مطلب اس خشکی کو پھیلا دیا، (اور اس پر پہاڑ لنگر انداز کر دیے۔)، یعنی خشکی/زمین کارپیٹ کی مانند ہیں، اگر "سطح" سیدھی ہوگی تو کارپیٹ سیدھا بچھے گا، اگر سطح گول ہوگی تو کارپیٹ اس پر اسی انداز سے بچھے گا۔

✐ سائنسی نقطہ نگاہ سے بھی یہ بات درست ہے کہ خشکی کے حصہ شروع میں نہ تھے، بلکہ آہستہ آہستہ بعد میں نمودار ہوئے۔

- In the very beginning, Earth was covered by a global magma ocean after its formation (≈4.54 billion years ago).
- As it cooled, the first **solid crust** formed — likely **basaltic**, similar to ocean floor today.
- Water vapor condensed to form the first oceans (around **4.4–4.3 billion years ago**).
- At this stage, Earth may have looked like a "**water world**" with only volcanic islands peeking out.

Growth of Continents

Continents didn't exist all at once — they started as **small islands and protocontinents**.

- Plate tectonics caused them to collide and merge, growing larger over billions of years.
- By about **2.5–2.0 billion years ago**, significant dry landmass existed.

Emergence Above Oceans

- Evidence suggests large-scale dry land only became stable around **3 billion years ago**.
- Before that, most continental crust was **submerged** or in small patches.
- By the **Proterozoic eon (2.5–0.5 Ga)**, continents grew big enough to form **supercontinents** (like **Columbia, Rodinia, and later Pangaea**).

7۔ وَ نَفۡسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ﴿۷﴾

اور نفس کی قسم اور جیسا کہ اس کو سنوارا۔

(اظہر)

نفس کا الہام (نیکی و بدی)
فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا
"پھر اس (نفس) کو اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری سجھا دی"
(الشمس، 91:8)

انسان کا بنایا جانا
لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ
"ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا"
(التین، 95:4)

نفس :جان، روح، انسان کا باطنی وجود۔ قرآن میں کبھی انسان کی "شخصیت" اور کبھی "خواہش" کے معنوں میں آتا ہے۔
سوّی (یسوي، تسوية): برابر کرنا، سیدھا کرنا، توازن میں لانا، ٹھیک ٹھاک کرنا۔
سوّاها :اس نے اسے سنوارا، متوازن بنایا، ہر قوت کو اپنی جگہ پر رکھا۔

اللہ نے کائنات کے بعد سب سے بڑی نشانی "انسان کے اپنے نفس" کو قسم میں شامل کیا تاکہ معلوم ہو کہ سب سے اہم حقیقت انسان کی اپنی روحانی و اخلاقی تشکیل ہے۔

انسان کا نفس اللہ کی سب سے بڑی تخلیق ہے۔ اس میں خیر اور شر دونوں کا ادراک رکھا گیا ہے۔ "سوّاها" یہ بتاتا ہے کہ اللہ نے انسان کو فطرتاً متوازن بنایا:

- اسے عقل دی ← حق و باطل میں فرق کرنے کے لیے۔
- اسے فطرت دی ← خیر کی طرف مائل رہنے کے لیے۔
- اسے ارادہ دیا ← عمل کے انتخاب کے لیے۔

اعتراض: اگر اللہ نے نفس کو خود سنوارا تو پھر انسان کیوں بگڑ جاتا ہے؟
جواب: اللہ نے نفس کو "صلاحیت" کے ساتھ متوازن بنایا، لیکن انتخاب کی آزادی دی۔ اگر انسان اپنی فطرت کی پیروی کرے تو سیدھا رہتا ہے، اگر خواہشات کی پیروی کرے تو بگڑ جاتا ہے۔

📖 یہ اس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔ (اسرار احمد)

✏ ان تین آیتوں میں بھی، جس میں "وما" آرہا ہے اس کا ترجمہ دو طرح سے کیا گیا ہے۔

📖 یعنی مَا بَنٰهَا ، اور مَا طَحٰهَا اور مَا سَوّٰ هَا ۔ اِس لفظ مَا کو مفسّرین کے ایک گروہ نے مصدری معنوں میں لیا ہے اور وہ اِن آیتوں کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ آسمان اور اس کے قائم کیے جانے کی قسم، زمین اور اس کے بچھائے جانے کی قسم، اور نفس اور اس کے ہموار کیے جانے کی قسم۔ ... دوسرے مفسّرین نے یہاں مَا کو مَنْ یا الذّی کے معنی میں لیا ہے، اور وہ اِن فقروں کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ جس نے آسمان کو قائم کیا، جس نے زمین کو بچھایا اور جن نے نفس کو ہموار کیا۔ (مودودی)

✏ میرے نزدیک پہلی معنیٰ زیادہ درست ہے، جس کی اسرار احمد، وحیدالدین، جوناگڑھی، غلام احمد پرویز، امین احسن اصلاحی نے وکالت کی۔

✏ اور میرے نزدیک یہ معنیٰ درست اس لیے ہے کہ، ایک تو قسم: گواہی/شہادت کے معنیٰ میں بھی آتی ہے۔ جیسا کہ امیں احسن اصلاحی نے اس سورہ کی پہلی آیت کا ترجمہ ہی یہ کیا ہے "شاہد ہے آفتاب اور اس کا چڑھنا"... یعنی جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے اسکا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ گواہ ہے یہ چیز، یہ عمل... کہ ہمارا قول سچا ہے۔ جیسے:

"یس، والقرآن الحکیم، انک لمن المرسلین – یعنی: یٰس، قرآن حکیم گواہ ہے کہ آپ مرسلین میں سے ہیں۔"
اگر یہی بات ہے تو پھر: گواہی ہمیشہ "دوسرا" دیتا ہے۔ بندہ خود کبھی اپنی گواہی نہیں دیتا۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کی گواہی کے لیے سورہ رعد، آیت 43 میں آیا:
یہ منکرین کہتے ہیں کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہو۔ کہو، ”میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے اور پھر اس شخص کی گواہی جو کتاب آسمانی کا علم رکھتا ہے “۔ (13:43)

تو اس منطق سے اللہ تعالیٰ ان آیات میں اپنی قسم نہیں کھا رہے۔ بلکہ جس چیز کی قسم کھائی جا رہی ہے، اس کے بعد اسی کی کسی بنیادی وصف کو بیان کیا جارہا۔
شمس کے ساتھ ضحیٰ، قمر تلھا، نہار جلاہا، لیل یغشٰھا۔۔۔
یعنی ہر آیت میں "ہا" کی ضمیر خود اُسی آیت کے پہلے لفظ کی طرف لوٹتی ہے۔ (واللہ اعلم)

✎ پھر اسی مناسبت سے سوال اٹھتا ہے کہ کیا قرآن میں کہیں اللہ نے اپنی قسم بھی کھائی ہے؟
جواب: اللہ نے قرآن میں اپنی قسم ضرور کھائی ہے، پر "میری قسم" کہہ کر نہیں بلکہ "ربک" تیرے رب کی قسم کہہ کر، (4:65)، (19:68)، یا خود دوسرے سے کہلوا کے کہ "کہو، میرے رب کی قسم – (قُل اِی وَرَبِّی اِنَّه لَحَقٌّ - کہو ''میرے رب کی قسم، یہ بالکل سچ ہے، (یونس، 10:53)، (تغابن، 64:7)۔۔۔

- اور ایک جگه آتا ہے: فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثۡلَ مَاۤ اَنَّكُمۡ تَنۡطِقُوۡنَ۲۳ – " پس قسم ہے آسمان اور زمین کے مالک کی، یه بات حق ہے۔ ایسی ہی یقینی جیسے تم بول رہے ہو "۔ (ذاریات، 51:23)

یعنی کہ (آسان الفاظ میں):

1. کہو، میرے رب کی قسم
2. تمہارے رب کی قسم
3. زمین و آسمان کے رب کی قسم، تم جو بول رہے ہو حق ہے۔

ان تینوں قسموں میں اللہ تعالیٰ ڈائریکٹلی اپنی قسم نہیں کھا رہے، پر یا تو دوسرے سے کہلوا رہے (کہو، میرے رب کی قسم) یا دوسرے کے کلام کے point of view سے ہی کہہ رہے۔ تیرے رب کی قسم، ...

جبکہ اس سورہ کی آیات میں "وما" سے ڈاریکٹ قسم کی بات ہور ہی: آسمان کی قسم اور جس نے اس کو بنایا۔
یہ ڈاریکٹ قسم ہے، جس کا لب و لہجہ ہمیں دوسری آیتوں میں نہیں ملتا۔ (کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قسم اس طرح کھائی ہو)
پھر اس حساب سے بھی، یہ معنیٰ درست نہیں، اور پہلی معنیٰ زیادہ قرینِ عقل ہے۔ (واللہ اعلم)

نفس سے مراد روح ہے یا جسم؟

📖 **قرآن مجید میں نفس کا دونوں معانی (روح و جسم) پر اطلاق ہوا ہے؟**

روح کے بارے میں سورہ زمر کی آیہ 42 میں آیا ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الۡاَنۡفُسَ حِيۡنَ مَوۡتِهَا وَالَّتِىۡ لَمۡ تَمُتۡ فِىۡ مَنَامِهَا ۚ(39:42)
"خدا موت کے وقت ارواح کو لے لیتا ہے۔"

اور جسم کے بارے مین سورہ قصص کی آیہ 33 میں آیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں:
قَالَ رَبِّ اِنِّىۡ قَتَلۡتُ مِنۡهُمۡ نَفۡسًا فَاَخَافُ اَنۡ يَّقۡتُلُوۡنِ (28:33)
"کہا، میں نے ان (ظالم فرعونیوں) میں سے ایک کو قتل کردیا ہے، مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے قتل کردیں گے۔"

لیکن یہاں مناسب یہ ہے کہ دونوں کو شامل ہو، کیونکہ خدا کی قدرت کی حیرت انگیزیاں جسم میں بھی موجود ہیں اور روح میں بھی، اور ان میں سے کسی ایک کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتیں۔ (نمونہ)

8۔ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَ تَقۡوٰىهَا ۪ۙ﴿۸﴾

پھر اس کو سمجھ دی،اس کی بدی کی اور اس کی نیکی کی۔
(وحیدالدین)

حق و باطل کا ادراک
وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ
"اور ہم نے اسے دو راستے (خیر و شر) دکھا دیے"
(البلد، 90:10)

انسان کی عقل و شعور
إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا
"ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، اب چاہے شکر گزار بنے یا ناشکرا"
(الانسان، 76:3)

انسان کا ضمیر
بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ
"بلکہ انسان اپنے آپ پر خود گواہ ہے"
(القیامۃ، 75:14)

⊙ **فَ** =پھر / پس
أَلْهَمَهَا =اس (اللہ) نے الہام کیا / سجھا دیا
فُجُورَهَا =اس کی بدکاری / برائی
وَ =اور
تَقْوَاهَا =اس کی پرہیزگاری / نیکی

لغوی و صرفی تحقیق

- **إلهام** :دل میں ڈالنا، اندرونی شعور دینا۔
- **فُجور** :اصل میں "چاک کرنا" ← گناہ، حد توڑنا، بے حیائی۔
- **تقوی** :بچنا، پرہیز کرنا، اللہ کے خوف سے برائی سے رک جانا۔

یعنی جبلتی طور پر انسان میں نیکی اور بدی دونوں رکھ دی گئی ہیں، اب انسان کے اوپر ہے چاہے تو تقویٰ کو feed کرے اور متقی بنے، چاہے تو فجور کی پرورش کرے اور فاجر بنے۔ اس مفہوم کی دلیل اگلی دونوں آیتوں میں مل جاتی ہے۔

اللہ نے انسان کو **ضمیر** دیا ہے۔ ضمیر وہ اندرونی قوت ہے **جو نیکی پر خوش اور برائی پر ملامت** کرتا ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ہر انسان کے اندر **"Potential for Good & Evil"**موجود ہے۔ اب یہ انسان پر ہے کہ وہ کس راستے کو اختیار کرتا ہے۔

? اعتراض: اگر اللہ نے بدی بھی الہام کی تو کیا انسان مجبور ہے گناہ کرنے پر؟
☑ جواب: نہیں۔ یہاں "الہام" کا مطلب "پہچان دینا" ہے، نہ کہ "مجبور کرنا"۔ یعنی انسان کو یہ شعور دیا گیا کہ فلاں کام برائی ہے اور فلاں نیکی۔ اختیار پھر بھی انسان کے پاس ہے۔

جدید نفسیات بھی بتاتی ہے کہ انسان میں **"Id" (خواہش)** اور **"Superego"(ضمیر)** کی کشمکش چلتی ہے۔ قرآن نے اسے 1400 سال پہلے "فجور" اور "تقویٰ" کہا۔
اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اخلاق تربیت کے بغیر انسان فطری صلاحیتوں کے باوجود بگڑ سکتا ہے۔

The **Id** and **Superego** are two core concepts from **Sigmund Freud's psychoanalytic theory of personality**. Freud divided the human psyche into three parts: **Id, Ego, and Superego.** Here's the breakdown:

---

1. Id

- **Nature**: Primitive, instinctual, unconscious part of the mind.
- **Principle**: Operates on the *pleasure principle* (seeks immediate gratification of desires, regardless of reality or consequences).
- **Drives**: Hunger, thirst, aggression, sex, survival impulses.
- **Example**: A baby crying when hungry or demanding food immediately without caring about time/place.

---

2. Superego

- **Nature**: Moral and ethical part of the personality, shaped by society, parents, and culture.
- **Principle**: Operates on the *morality principle* (what is right or wrong, good or bad).
- **Function**: Judges actions, creates feelings of guilt when you do wrong, and pride when you do right.
- **Example**: You feel guilty after lying, or proud after helping someone.

---

3. Ego (the balancing part, for context)

- **Nature**: The rational part that mediates between the Id (desires) and Superego (morals).
- **Principle**: Operates on the *reality principle* (tries to satisfy the Id's needs in a socially acceptable way).
- **Example**: You want to eat a whole cake (Id), but your Superego says it's wrong; your Ego compromises by allowing you one slice.

In short:

- **Id = "I want it now."**
- **Superego = "You shouldn't do that, it's wrong."**
- **Ego = "Let's find a realistic, acceptable way."**

الہام کسے کہتے؟

📖 الہام کسی کے دل میں کوئی بات ڈالنے کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کے دل میں ڈالی جانے والی بات کے لیے مخصوص ہے۔ ہم نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ الہام کا تعلق باطنی شعور سے ہے۔ الہام ایک اشراقی عمل ہے۔ الہام تحت الشعور میں ہوتا ہے جب کہ وحی شعور میں ہوتی ہے۔ الہام اشراقی لہروں کے ذریعے ذہن کے تصورات میں آنے والے بغیر حروف و اصوات کے مطالب ہیں۔ (کوثر)

📖 "الہمہا"، "الہام" کے مادہ سے اصل میں تو کسی چیز کے نکلنے یا پینے کے معنی میں ہے، اور اس کے بعد پروردگار کی طرف سے انسان کی روح میں کسی مطلب کے القاء کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ گویا انسان کی روح اس مطلب کو اس کے سارے وجود کے ساتھ پی لیتی ہے اور نگل جاتی ہے۔ اور کبھی وحی کے معنی میں بھی آیا ہے۔ لیکن بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ "الہام" اور "وحی" میں فرق یہ ہے کہ وہ شخص جسے الہام ہوتا ہے وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ مطلب اُسے کہاں سے حاصل ہوا ہے، جب کہ وحی کے وقت وہ جانتا ہوتا ہے کہ یہ اُسے کہاں سے اور کس ذریعے سے پہنچتی ہے۔ (نمونہ)

📖 باقی رہا یہ تصور کہ فلاں بزرگ کو خدا کی طرف سے اِلْہَام ہوتا ہے تو اس کی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ قرآن کریم کی رو سے، علم کے سرچشمے دوہی ہیں۔ ایک وحی۔ یعنی خدا کی طرف سے براہ راست علم کا ملنا۔ یہ حضرات انبیاء کرام ؑ کے ساتھ

مخصوص تھا اور ختم نبوت کے ساتھ اس کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ دوسرا، عقلِ انسانی(Human Intellect) ۔ اس میں ہر انسان شریک ہوتا ہے۔ لہٰذا، ختم نبوت کے بعد، اب دو چیزیں ہمارے پاس رہ گئیں۔ ایک تو وحی کی رو سے ملی ہوئی تعلیم، جو قرآن کریم کے اندر ہے۔ اور دوسرے عقل انسانی۔ اب صحیح راستہ یہ ہے کہ زندگی کے معاملات کا حل قرآن کریم کی روشنی میں انسانی عقل و بصیرت کے رو سے کیا جائے۔ بنا بریں، یہ تصور کہ رسول اللہ ؐکے بعد ، کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست کوئی علم عطا ہوتا ہے (جسے کشف یا الہام کہتے ہیں) ایسا عقیدہ ہے جس سے ختم نبوت کی مہر ٹوٹتی ہے۔ جیسا کہ اوپر کیا گیا ہے اس کی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ نہ ہی کشف، الہام، وحیِ خفی، وغیرہ اصطلاحات کا کوئی ذکر رسول اللہ ؐکے زمانہ میں ملتا ہے۔ یہ سب اصطلاحات بعد کی وضع کردہ ہیں اور دوسروں سے مستعار لی ہوئی۔ (دیکھئے عنوان۔ و۔ ح۔ ی)۔
انسان اگر اپنی قوت خیال یا قوت ارادی کو ایک خاص طریق سے (Develop)کر لے تو اس سے بعض ایسی باتیں سرزد ہونے لگتی ہیں جو عقلِ عامہ کی رُو سے مستبعد ہوتی ہیں۔ لوگ انہیں خوارقِ عادات یا کرامات سمجھنے لگ جاتے ہیں، اور جس سے ایسی باتیں سرزد ہوں ، اسے صاحب کشف و الہام قرار دیتے ہیں، اور "روحانی قوتوں" کا مالک۔ لیکن ان باتوں کا "روحانیت" (یا دین) سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، یہ محض قوتِ ارادی کی نشوونما (Development) کے کرشمے ہیں جسے ہر انسان (بلا تمیز مذہب و ملت) خاص مشق کے ذریعے حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اب مغرب (بالخصوص امریکہ) میں، اسے بطور

فن کے حاصل کرنے کی درسگاہیں قائم ہو رہی ہیں اور اس سے اعصابی بیماریوں کے علاج میں مدد لی جاتی ہے۔ اسے پھر اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہئے کہ خدا سے براہ راست علم، صرف وحی کے ذریعے مل سکتا ہے جو حضرات انبیاء کرامؑ سے مخصوص ہے۔ اور چونکہ اب نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اس لیے اب کسی شخص کو خدا سے براہ راست علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ وحی کو الہام بھی نہیں کہنا چاہئے۔ اور نہ ہی یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ اب کسی شخص کو خدا بذریعہ الہام براہ راست علم عطا کرتا ہے۔ (مفہوم القران – غلام احمد پرویز)

✎ اس آیت میں "الہام" سے مراد، اللہ تعالیٰ نے انسان یا نفس میں ایک چیز اُس کی خلقت کے دوران ہی ڈال دی تھی۔

9۔ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰٮهَا ۙ﴿۹﴾

یقینا کامیاب ہوگیا جس نے اس (نفس) کو پاک کرلیا۔

(اسرار احمد)

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ

"بیشک وہ کامیاب ہوا جس نے پاکیزگی اختیار کی"

(الأعلى، 87:14)

دل کی طہارت

يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ

"اس دن مال اور بیٹے کچھ فائدہ نہ دیں گے سوائے اس کے جو اللہ کے پاس پاک دل لے کر آئے"

(الشعراء، 26:88-89)

تزکیہ ہی اصل کامیابی

وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِۦ فَأُوْلَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ

"اور جو اپنے نفس کی بخل سے بچا لیا گیا، وہی فلاح پانے والے ہیں"

(الحشر، 59:9)

⊙ **آیت کا لفظ بہ لفظ ترجمہ**

- **قَدْ** =یقیناً / بلاشبہ
- **أَفْلَحَ** =کامیاب ہوا / فلاح پا گیا
- **مَن** =وہ جس نے
- **زَكَّاهَا** =اس (نفس) کو پاک کیا / سنوارا

لغوی و صرفی تحقیق

- **أفلح** :فلاح پانا، کامیاب ہونا۔ "فلح" اصل میں کھیتی کو کاٹنے اور پھل حاصل کرنے کے لیے آتا ہے ← یعنی محنت کا نتیجہ پانا۔
- **زکّی** :پاک کرنا، بڑھانا، سنوارنا۔ "تزکیہ" کا مطلب صرف گناہوں سے بچنا نہیں بلکہ خوبیوں کو پروان چڑھانا بھی ہے۔

انسان کے اندر خیر و شر کی صلاحیت موجود ہے (آیت 8)، مگر کامیاب صرف وہ ہے جو اپنے نفس کو "تزکیہ" کے ذریعے سنوارتا ہے۔ تزکیہ کے معنی:

1. گناہوں اور برائیوں سے بچنا۔
2. ایمان اور اخلاق کی نیکیاں پروان چڑھانا۔

یہی اصل فلاح ہے، دنیا اور آخرت دونوں میں۔

✿ آیت نہایت جامع ہے: صرف چار الفاظ میں انسان کی کامیابی کا راز بتا دیا۔

جبر و تفویض

یاد رہے یہ آیت قد افلح من زکاھا... اس بات کی ناقابل رد دلیل ہے کہ انسان اپنے افعال میں خودمختار ہے اور اپنے مستقبل کو سنوارنا یا بگاڑنا اس کے اپنے اختیار میں ہے وہ ہرگز مجبور و مقہور نہیں ہے۔ (فیضان الرحمٰن)

نفس کا تزکیه کیسے کریں؟

? نفس کی تزکیہ / پاک کرنے کی قرآن بار بار تاکید کرتا ہے۔ پر نفس کا تزکیہ کیسے ہو؟

✎ اسکا سیدھا سادھا بنیادی جواب یہ ہے کہ: انسان اور کچھ نہ کرے بس واجبات ادا کرے اور محرمات سے بچے۔ (بنیادی طور پر اس پر سختی سے عمل کرنا ہے کامبیابی کے لیے کافی ہے)
دوسرا یہ کہ، قرآن کی "تلاوت" کرے، اور قرآن پر عمل کرے۔

یاد رہے، اصل چیز معلومات نہیں اصل چیز عمل ہے۔ معلومات چاہے کتنی بھی انسان حاصل کرلے، عمل نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اور علم اگر کم ہی ہو پر عمل کے ساتھ ہے تو بہت خوب ہے۔ (ورنہ زیادہ علم اور کم عمل کی مثال تو اللہ تعالیٰ نے سورہ جمعہ آیت 5 میں اس طرح دی ہے کہ جن لوگوں نے تورات کا وزن اٹھایا پر اللہ کی آیات کی تکذیب کی تو پھر ان کی مثال گدھے جیسے ہے جو کتابوں کا وزن تو اٹھاتے ہیں پر اس سے فائدہ ان کو کچھ نہیں ملتا...)

✎ جیسا اس اسلام کا کلمہ ہی "لا" سے شروع ہوتا، تو نفس کی تزکیہ کے لیے سب سے پہلے انسان کو ہر غلط کو "لا" کہنا ہے۔ نیکی کا کام بہت خوب، پر پہلے برائی سے بچنا ہے، نہ اپنے اندر کو دھوکا دینا ہے، اور نہ ظاہرا دھوکا دینا ہے، چاہے خود کو یا دوسروں کو۔ ہر حال میں ایمانداری کو خاطر ملحوظ رکھنا ہے۔
حق بات بولنی ہے،
حق بات قبول کرنی ہے،

حق بات بیان کرنی ہے۔

یعنی علمی اور عملی طور پر ہر غلط کو "لا" کہنا ہے۔ ظاہر شرک سے خود کو پاک کرنے سے لے کر، (حرام کام سے لازمی بچتے ہوئے) چھوٹے سے چھوٹے مکروہ کام سے بھی براءت کرنا دراصل نفس کا تزکیہ ہے۔

تزکیۂ نفس(In Short)

1. **دل کو پاک رکھنا** ←کینہ، غرور، حسد، لالچ جیسے اندرونی امراض کو ختم کرنا۔
2. **ایمان کو مضبوط کرنا** ←اللہ کی یاد، نماز، قرآن کی تلاوت اور ذکر سے دل کو روشن رکھنا۔
3. **خواہشات پر قابو پانا** ←نفس کہتا ہے جلدی فائدہ اٹھا لو، مگر تزکیہ یہ ہے کہ صبر اور ضبط سے صحیح راستہ اختیار کیا جائے۔
4. **عملِ صالح** ← جھوٹ، دھوکہ، ظلم، بے حیائی چھوڑ کر سچائی، عدل، عفت، اور خدمت کو اپنانا۔
5. **توبہ و استغفار** ← گناہ ہو جائے تو فوراً رجوع کرنا اور دل کو صاف کرنا۔
6. **انفاق و سخاوت** ← دل کو دنیا کے لالچ سے پاک کرنے کے لیے مال خرچ کرنا (زکات/صدقہ)۔
7. **احسان کا درجہ** ← عبادت ایسے کرنا جیسے اللہ کو دیکھ رہے ہو، اور اخلاق میں سب سے بہترین ہونا۔

10۔ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا ۙ‏ ۱۰

اور یقیناً جس نے اسکو خاک آلود کیا نامراد ٹھرا۔

(اظھر)

اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوۡرًا ۳ (دھر، 76:3)

دل کی بیماری

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا

"ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری بڑھا دی"

(البقرۃ، 2:10)

خواہشات کی پیروی

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَـٰهَهُ هَوَاهُ
"کیا تم نے اسے دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا"
(الجاثیہ، 45:23)

نفس کی خواہشات کا تباہ کرنا
وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ
"اور اس کا کہنا نہ مان جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور جو اپنی خواہش کے پیچھے چل پڑا"
(الکہف، 18:28)

آیت کا لفظ بہ لفظ ترجمہ

- **وَ** =اور
- **قَدْ** =یقیناً / بلاشبہ
- **خَابَ** =ناکام ہوا / نامراد ہوا
- **مَن** =وہ جس نے
- **دَسَّاهَا** =اسے (نفس کو) دبایا / آلودہ کیا / بگاڑ دیا

لغوی و صرفی تحقیق

- **خاب** :ناکام ہونا، مراد نہ پانا۔
- **دسّی** (یدسّ): چھپانا، دبا دینا، گندگی میں ڈال دینا۔
- **دسّاها** :اپنے نفس کو دبایا، آلودہ کیا، یا برائی میں گم کر دیا۔

دَسّٰیہَا:(د س س) دسّ کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں زبردستی ٹھونسنے کے ہیں۔ (کوثر)

جب (جاہلیت عرب میں) انہیں لڑکی پیدا ہونے کی اطلاع ملتی تو وہ سوچتے کہ اَمْ يَدُسُّه فِي التُّرَابِ [16:59]۔ "یا وہ اسے زمین میں دفن کر دے"۔ (لغت)

(لفظ دسّٰھا سے) مراد آسمانوں کی طرف پرواز کرنے کے بجائے زمین کی گہرائیوں میں دھنستے چلے جانا۔

اگر تصور کریں کہ نیکی سے انسان کو پَر لگ جاتے ہیں۔ اور جتنی زیادہ نیکیاں اور جتنی بڑی عبادتیں ہوں گی، اتنے زیادہ اور اتنے بڑے پَر لگ جاتے، جس سے انسان اوپر کو پرواز کرتا ہے۔ جتنے زیادہ پر، اور جتنے بڑے پِر اتنی زیادہ تیز رفتاری سے اوپر کو اڑان۔

پر جب گناہ کرتا ہے تو پھر اس کے پر کٹتے جاتے، ٹوٹتے جاتے، چھوٹے ہوتے جاتے، اور کم ہوتے جاتے، اور جب پر پوری طرح کٹ جاتے، اور مزید گناہوں میں اضافہ ہوتا، بداخلاقی میں اضافہ ہوت، "نفس کا دسٰھا" ہوتا جاتا، تو پیروں میں بڑے بڑے پتھر باندھ دیے جاتے، جس سے اسکی اڑان تو ختم ہی ہوجاتی، بلکہ مزید تیزی سے نیچے کی طرف گرتا جاتا (دسٰھا)۔ جتنی زیادہ اور جتنے بڑے گناہ اتنے وزنی کئی من ٹن کے پتھر بندھ جاتے جو اسے نیچے کی طرف کھینچتے چلے جاتے، اور زمین کی گہرائیوں میں (پاتال میں) اسے دھنسا دیتے۔ اس طرح نیکی اور بدی کی کشمکش ہوتی (فَأَلۡهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقۡوٰىهَا) ...

پر تزکیہ سے ان گناہوں کے بوجھ کی رسیاں ٹوٹتی جاتی، اڑان شروع ہوتی، اور وزن کم ہوتا چلا جاتا۔ پر اگر بندہ نیکی بھی کرے، اور گناہ بھی کرے تو یہ بیچ کی کشمکش میں پھنسا رہتا، کبھی تھوڑا اڑتا، تو پھر تھوڑا گرتا... جب تک پیروں میں بندھی رسیوں کو پورا کاٹا نہ جائے، اونچی اڑان مشکل ہے۔

تزکیہ نفس (انفرادی) کے بعد تزکیہ اجتماعی (قوم) کا ذکر

📖 اب اگلی آیات میں ایک قوم یا ایک معاشرے کے اجتماعی ضمیر کے حوالے سے ایک مثال دی گئی ہے۔ ظاہر ہے جس طرح ایک انسان کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز ہوتی ہے اسی طرح ہر معاشرے میں اجتماعی طور پر بھی اخلاقی حس پائی جاتی ہے' اور جس طرح ایک انسان میں اچھے برے داعیات ہوتے ہیں اسی طرح ہر معاشرے کے اندر بھی نیکی کے علمبردار اور شر پھیلانے والے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ غرض جس طرح ایک فرد کا ضمیر ہوتا ہے اسی طرح معاشروں اور قوموں کا اجتماعی ضمیر بھی ہوتا ہے۔ چناچہ اگر کسی قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ ہو' اس کی صفوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ احسن طریقہ سے ادا کیا جا رہا ہو تو اس قوم کے مجموعی حالات بہتر طور پر چلتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی قوم کا اجتماعی ضمیر مردہ ہوجائے اور اس کی اخلاقی حس بحیثیت مجموعی اس قدر کمزور ہوجائے کہ اس کے ماحول میں برائی کو برائی کہنے والا بھی کوئی نہ رہے تو ایسی قوم اپنے زندہ رہنے کا جواز کھو دیتی ہے۔ (اسرار احمد)

11- كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ﴿۱۱﴾

(قوم) ثمود نے اپنی سرکشی کے باعث جھٹلایا۔

(جوناگڑھی)

← قومِ ثمود کی سرکشی

فَأَمَّا ثَمُودُ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَى عَلَى الْهُدَى

"پھر ثمود نے ہدایت کے مقابلے میں اندھے پن کو پسند کیا"

(فصلت، 41:17)

← پانی کی تقسیم پر انکار
فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا
"تو اللہ کے رسول نے ان سے کہا: اللہ کی اونٹنی اور اس کے پانی پینے کا حق چھوڑ دو، مگر انہوں نے اسے جھٹلایا اور اونٹنی کو کاٹ ڈالا"
(الشمس، 14-91:13 / القمر، 29-54:28)

← عذاب کی گرفت
فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ
"تو انہیں سخت آواز نے پکڑ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے"
(ھود، 11:67)

یہاں قرآن بتاتا ہے کہ انسانی ناکامی صرف انفرادی نہیں، اجتماعی بھی ہوتی ہے۔ قوم ثمود نے اجتماعی طور پر اپنے نبی کو جھٹلایا اور سرکشی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اجتماعی عذاب آیا۔
یہ سبق ہے کہ جب قوم اپنی اجتماعی اخلاقیات کو بگاڑتی ہے تو پوری قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

? "بطغواھا" کہا گیا، حالانکہ ایک فرد (قدار بن سالف) نے اونٹنی کو کاٹا، پوری قوم پر عذاب کیوں آیا؟

☑ جواب: قرآن کے مطابق قوم نے اجتماعی طور پر اس فیصلے کی تائید کی تھی۔ اجتماعی جرم اجتماعی عذاب کا سبب بنا۔ یہ قانون آج بھی درست ہے: اگر برائی پر قوم خاموش ہو تو وہ بھی مجرم ہے۔

12۔ اِذِ انۢبَعَثَ اَشۡقٰهَا ﴿١٢﴾

جب ان میں کا بڑا بدبخت اٹھ کھڑا ہوا۔
(جوناگڑھی)

← قوم کے شقی ترین فرد کا ذکر
فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَىٰ فَعَقَرَ
"تو انہوں نے اپنے ساتھی کو پکارا، پھر اس نے ہمت کر کے اونٹنی کو کاٹ ڈالا"
(القمر، 54:29)

← بنیادی سرکشی ایک فرد نے کی، قوم شریک ہوئی
فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا
"تو انہوں نے جھٹلایا اور اونٹنی کو کاٹ ڈالا"

(الشمس، 91:14)

← قوم پر اجتماعی عذاب
فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ
"تو انہیں سخت چیخ نے آ پکڑا"
(هود، 11:67)

⦿ **إِذْ** = جب
انبَعَثَ = اٹھ کھڑا ہوا / حرکت میں آیا
أَشْقَاهَا = ان میں سب سے زیادہ بدبخت (شقی)

انبَعَثَ: اٹھ کھڑا ہونا، حرکت میں آنا، عزم کرنا۔
أشقى" :شقی" (بدبخت) کی تفضیل ہے، یعنی سب سے زیادہ بدبخت۔
"أشقاها" → ان سب میں سب سے بدبخت۔

قرآن یہ بتاتا ہے کہ بعض اوقات ایک قوم کی اجتماعی **بربادی کا آغاز کسی ایک "شقی ترین" شخص کے عمل سے ہوتا ہے**۔ لیکن اگر قوم خاموش رہے یا حمایت کرے تو سب ذمہ دار ہو جاتے ہیں۔
یہاں سبق یہ ہے کہ قوم کو اپنے بدترین افراد کے ہاتھوں یرغمال نہیں بننا چاہیے۔

? اعتراض: اگر جرم ایک فرد نے کیا تو پوری قوم پر عذاب کیوں آیا؟
☑ جواب: قوم کے باقی لوگ یا تو اس کے ساتھ متفق تھے یا خاموش رہے۔ اجتماعی برائی میں خاموشی بھی جرم ہے۔ اس لیے پوری قوم عذاب کی مستحق ہوئی۔

✎ **ایک فرد اجتماعی اصلاح کیسے کرے؟**
ایک بندہ کہہ سکتا: "میں خود کو تو ٹھیک کرسکتا ہوں، پر معاشرے کی اصلاح میں اکیلا کیسے کروں، معاشرہ اگر غلط ہے تو اس میں میرا کیا قصور"؟

✎ **اسکا جواب، اسی واقعہ میں مضمر ہے کہ: "ناقۃ اللہ" کو کاٹنے والے، ایک یا چند افراد تھے، پر باقی سب لوگ ان کے اس عمل پر**

راضی تھے۔ اسی وجہ وہ بھی ان کے عمل میں شامل قرار پائے اور عذاب کے مستحق بنے۔ (ایسی ہی ایک معاشرتی / اجتماعی مثال اصحاب سبت میں آئے گی، کہ وہاں لوگ تین قسموں میں بٹ گئے تھے، ایک برائی کرنے والے، ایک غیر جانبدار، اور اصلاح کرنے والے – یعنی امربالمعروف نہی عن المنکر کرنے والے۔ پھر خدا کا جب عذاب آیا تو یہ آخری طبقہ بچ گیا، اور پہلے دونوں مسخ ہوگئے۔

اس لیے بندہ فردِ واحد ہی صحیح، اس کو اپنے لیول کے ہر حد تک معاشرے کی اصلاح کرنی چاہیے۔ ہاتھ سے، زبان سے، نہیں تو کم سے کم دل میں برا جانے۔

اشقیٰ الاولین، و اشقیٰ الآخرین

📖 " یا علی ! اشقی الاولین عاقر الناقة، اشقی الأخرین قاتلک، و فی روایة من یخضب هٰذه من هٰذا:

" اے علی ! پہلے لوگوں میں سے بد بخت ترین شخص وہ تھا جس نے ناقہ صالح کو قتل کیا ، اور پچھلے لوگوں میں سے بد بخت ترین آدمی تیرا قاتل ہے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ جو اس سے رنگین کرے گا، (جو اس طرف اشارہ ہے کہ تیری داڑھی کو تیرے سر کے خون سے خضاب کرے گا)۔ (نمونہ)

📖 جناب عمار بن یاسر سے روایت ہے کہ میں اور حضرت علی علیہ السلام غزوہ عُسرہ کے موقع پر کھجوروں کے ایک جھنڈ کے سائے

تلے گردوغبار والی زمین پر سوئے ہوئے تھے۔ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے پاس تشریف لے آئے۔ اس وقت ہمارے جسم خاک آلود تھے۔

آپ ﷺ نے امام علی علیہ السلام سے فرمایا: کیا میں تم کو کائنات کے دو بدبخت ترین آدمیوں کے نام بتائوں؟

ہم نے عرض کیا: جی ہاں! فرمائیے۔

آپؐ نے فرمایا: ایک وہ جس نے ناقہ صالح کو قتل کیا اور دوسرا وہ جوآپؑ کے اس (مقام) پرضرب لگائے گا (آپؐ نے علیؑ کے سر پر ہاتھ رکھا جس سے آپؑ کے سر کے خون سے آپؑ کی داڑھی رنگین ہوجائے گی۔ (تفسیر نورالثقلین)

✎ **اونٹنی کو مارنے میں 9 بندے تھے (سورہ نمل، 27:48) اور عورتوں کا کردار بھی تھا... بالکل ایسے ہی... امام علی کے قتل کے بارے میں لکھا ہے۔ "**

📖 **"کچھ روایات کے مطابق جنگ نہروان کی شکست کے بعد متعدد خارجیوں نے مکہ مکرمہ میں ملاقات کی اور 40ھ کی جنگ نہروان پر تبادلہ خیال کیا جس میں خارجیوں کے سیکڑوں ساتھی علی کی فوج سے علیحدگی کے بعد علی کی افواج کے ہاتھوں مارے گئے۔ صرف 9 آدمی خوارج کے زندہ بچ کر فرار ہویے باقی سب میدان جنگ مارے گئے۔ ان 9 خارجیوں میں سے 3 خارجیوں نے اسلام کے تین رہنماؤں کے قتل پر راضی ہو گئے۔ جن تین لوگوں کو قتل کرنا تھا ان میں علی المرتضی، امیر معاویہ اور عمرو بن العاص کے نام شامل تھے۔" (ابن ملجم وکیپیڈیا اردو)**

"کوفہ میں اس کی ملاقات قبیلہ تیم الرباب کے دس لوگوں سے ہوئی جن میں ایک عورت "قطام" بھی شامل تھی یہ لوگ علی سے اپنے رشتہ داروں کی موت کا بدلہ لینے کو اکٹھے ہوئے تھے۔ قطام کے والد اور بھائی بھی النہروان پر علی کی فوج کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔[5] ابن ملجم نے جونہی قطام کو دیکھا تو عالم دین علی الصلابی کے مطابق اپنے ہوش گنوا بیٹھا اور کوفہ آمد کا مقصد بھول گیا۔ ابن ملجم نے قطام کو شادی کی دعوت دی تو قطام نے شادی کے بدلے اپنی شرائط رکھی کہ اُسے ہزاروں سونے کی اشرفیاں، مغنیہ اور ایک غلام مرد کے علاوہ علی کی موت بطور مہر چاہیے۔" (قتل علی بن ابی طالب، وکیپیڈیا، اردو) ۔

اور بخاری کی حدیث ہے `:نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”تم اپنے سے پہلی امتوں کی ایک ایک بالشت اور ایک ایک گز میں اتباع کرو گے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے سوراخ میں داخل ہوئے ہوں گے تو تم اس میں بھی ان کی اتباع کرو گے۔“ (بخاری، 7320)

13۔ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا ﴿۱۳﴾

تو اللہ کے رسول نے ان سے کہا، اللہ کے ناقہ اور اس کے پانی پلانے (کا خیال رکھنا)

(اظھر)

← اونٹنی اللہ کی نشانی
هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً

"یہ اللہ کی اونٹنی ہے تمہارے لیے نشانی"
(الأعراف، 7:73)

← پانی کی تقسیم کا قانون
وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ
"اور انہیں خبر دے دو کہ پانی ان کے درمیان تقسیم ہے، ہر ایک کا پینے کا وقت مقرر ہے"
(القمر، 54:28)

← قوم صالحؑ کو تنبیہ
وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيبٌ
"اور اسے برائی کے ساتھ ہاتھ نہ لگانا ورنہ تمہیں قریب عذاب آ لے گا"
(هود، 11:64)

- **فَ** =تو / پس
- **قَالَ** =کہا
- **لَهُمْ** =ان سے / ان کے لیے
- **رَسُولُ اللَّهِ** =اللہ کے رسول (حضرت صالحؑ) نے
- **نَاقَةَ اللَّهِ** =اللہ کی اونٹنی کے بارے میں (خبردار رہو)
- **وَسُقْيَاهَا** =اور اس کے پانی پینے کا حق

لغوی و صرفی تحقیق

- **ناقة :**مادہ اونٹ۔ یہاں مخصوص اونٹنی مراد ہے جو اللہ کی نشانی کے طور پر معجزہ کے طور پر دی گئی تھی۔
- **سقیا** :پینے کا وقت یا حقِ سیرابی۔ یعنی پانی کی تقسیم میں اونٹنی کا حصہ بھی مقرر تھا۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ انبیاء کی بعثت کا **مقصد محض عبادت کی تلقین نہیں بلکہ سماجی انصاف بھی ہے۔** پانی جیسی نعمت کی تقسیم میں بھی اللہ کا حکم ہے۔ قوم ثمود کے بگاڑ کی جڑ یہی تھی کہ وہ اجتماعی حقوق کو پامال کر رہے تھے۔

ایک اونٹنی کے پینے کے حق پر اتنی بڑی قوم کے عذاب کا سبب کیوں بنا؟

جواب: اصل مسئلہ اونٹنی نہیں، **بلکہ سرکشی اور اللہ کی نشانی کا انکار تھا۔** اللہ نے اسے "آزمائش" بنایا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے اللہ کی واضح نشانی کو جھٹلایا اور اس کے حکم کو توڑا۔

یہ آیت **"وسائل کی تقسیم"** اور **"اجتماعی انصاف"** پر زبردست سبق دیتی ہے۔

- آج بھی پانی، بجلی، توانائی وغیرہ کی تقسیم میں ناانصافی قوموں کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔
- اللہ کے حکم کے بغیر وسائل پر قبضہ کرنا "طغیان" ہے۔

14۔ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۪ۙ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿۱۴﴾

پھر انہوں نے تکذیب کی اور اُس کی کونچیں کاٹ دی، تو اُن کے رب نے ان کے گناہوں کی وجہ سے تباہ کردیا اور (شہر) ہموار کردیا۔

(اظهر)

← قوم کا جھٹلانا اور اونٹنی کا کاٹ دینا
فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَىٰ فَعَقَرَ
"تو انہوں نے اپنے ساتھی کو پکارا، پھر اس نے ہمت کر کے اونٹنی کو کاٹ ڈالا"
(القمر، 54:29)

← رسول کی تکذیب پر عذاب
فَعَقَرُوا النَّاقَةَ فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ
"تو انہوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی، پھر انہیں چیخ نے پکڑ لیا"
(الأعراف، 7:77)

← قوموں کی اجتماعی ہلاکت
وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ مِن بَعْدِ نُوحٍ
"اور ہم نے نوح کے بعد کتنی ہی قوموں کو ہلاک کیا"
(الإسراء، 17:17)

لفظ بہ لفظ ترجمہ

- **فَكَذَّبُوهُ** =تو انہوں نے اسے جھٹلایا (رسول صالحؑ کو)
- **فَعَقَرُوهَا** =پھر انہوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا
- **فَدَمْدَمَ** =تو چڑھ دوڑا / سختی سے عذاب نازل کیا
- **عَلَيْهِمْ** =ان پر
- **رَبُّهُم** =ان کے رب نے
- **بِذَنبِهِمْ** =ان کے گناہ کے سبب
- **فَسَوَّاهَا** =پھر اس نے سب کو برابر کر دیا / ہلاک کر دیا

یہ آیت بتاتی ہے کہ جب برائی اپنی انتہا کو پہنچ جائے تو اللہ کا عذاب لازمی ہے۔
قوم نے پہلے رسول کی تکذیب کی ← پھر واضح نشانی کو کاٹا ← پھر اجتماعی تباہی آئی۔
یہ قانون آج بھی موجود ہے: اجتماعی بغاوت اجتماعی عذاب کو دعوت دیتی ہے۔

بلاغتی پہلو

لفظ "**سَوَّاهَا**" آیت 7 میں انسان کے نفس کے لیے آیا تھا، اور اب آیت 14 میں شہر کو برابر/ہموار/سیدھا کرنے کے معنی میں۔

15- وَ لَا یَخَافُ عُقۡبٰہَا ﴿۱۵﴾

اور وہ اس کے انجام سے نہیں ڈرتا۔

—(بیان القرآن ڈاکٹر اسرار احمد)

یا

اور وہ ان کے عاقبت (کے عذاب) میں تخفیف نہیں کریگا۔

(اظھر)

← اللہ کی پکڑ کا خوف نہ ہونا
إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ
"بیشک تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے"
(البروج، 85:12)

← اللہ کسی کے خوف میں نہیں
إِنَّ اللَّهَ لَا يَخَافُ مِنْ شَيْءٍ
"اللہ کسی چیز سے خوف نہیں رکھتا" (مفہوم متعدد آیات سے)

← قوموں پر اللہ کا عذاب
فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنبِهِ
"پھر ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ کے سبب پکڑ لیا"
(العنکبوت، 29:40)

⊙ وَ =اور
- لَا =نہیں
- يَخَافُ =ڈرتا ہے / خوف کرتا ہے
- عُقْبَاهَا =اس کے انجام سے / اس کے بعد کے نتیجے سے

لغوی و صرفی تحقیق
- **عُقبیٰ** :انجام، نتیجہ، بعد کا اثر۔
- "عقباہا" ← قوم ثمود پر عذاب کے بعد کے انجام سے۔
- مطلب یہ ہے کہ اللہ جب فیصلہ کر لیتا ہے تو کسی کے نتائج یا اعتراض کا خوف نہیں رکھتا۔

اللہ جب کسی قوم کو ہلاک کرتا ہے تو وہ سراسر عدل و حکمت پر مبنی ہوتا ہے، اور اللہ کو کسی اور کے اعتراض یا انجام کا خوف نہیں۔

? اعتراض: "اللہ نہیں ڈرتا" کہنا کیا anthropomorphic (انسانی صفات دینا) نہیں؟

جواب: یہ اسلوب مجازی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے فیصلے قطعی ہیں اور اس پر کوئی غالب یا حاکم نہیں جو اس سے بازپرس کر سکے۔ (لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ – الأنبياء، 21:23)

- **دنیاوی طاقتیں اپنی سزا سے ڈرتی ہیں (قومی ردعمل، سیاسی نتائج وغیرہ)، مگر اللہ کے فیصلے حتمی ہیں۔**

خوف

یہ آخری آیت، میں ضـمیر "وہ" اگر اللہ کی طرف ہے تو اللہ تعالیٰ کہتا: اللہ تعالیٰ کو ان کے انجام سے خوف نہیں کرتا.

یہی مفہوم عموما مفسرین نے لکھا ہے:

📖 اللہ تعالیٰ کو اپنے اس فعل کے کسی برے نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے کہ اس کے بعد کیا ہوگا ؟ وہ پوری کائنات کا مالک اور خالق ہے ' وہ جو چاہے کرے۔ (اسرار احمد)

✏ یہ لفظ "یخاف" یعنی خوف اللہ تعالٰی کی ذات پر کیسے عائد ہوتا ہے؟
جبکہ اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب کرے تو اللہ سے کوئی پوچھنے والا نہیں!
اس لیے لفظ خوف کو اللہ تعالیٰ کے اوپر عائد کرنا، تھوڑا عجیب سا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ ایسے کیوں کہتے ہیں، کہ وہ ان کے انجام سے نہیں ڈرتا؟
اللہ تعالیٰ تو ویسے بھی کسی چیز سے خوف نہیں کھاتے، بلکہ "خوف" خود خدا کی مخلوق ہے، تو مخلوق کی کیفیت خالق پر عائد کیسے ہوگی؟

✏ لفظ " خَوْفٌ " کی معنٰی اگر لغت/ ڈکشنری میں چیک کی جائے تو پتا چلتا ہے ، کی کم سے کم تین بنیادی معنیٰ ہیں۔

1. غلط روش کے تباہ کن نتائج کے احساس اور اندیشہ سے اس روش سے مجتنب رہنا۔ چنانچہ سورۃ نحل میں اشیائے کائنات، اور ملائکہ کے متعلق ہے يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ [16:50]۔ (یعنی ڈر/گھبراہٹ)

2. **خَوْفٌ کے معنی خطرہ ہ دہشت، چنانچہ [33:19] میں خَوْفٌ کے معنی قتل و قتال کے کئے گئے ہیں۔**

فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِىْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ (احزاب، 33:19)

پھر جب خوف ودہشت کا موقعہ آجائے تو آپ انہیں دیکھیں گے کہ آپ کی طرف نظریں جما دیتے ہیں اور ان کی انکھیں اس طرح گھومتی ہیں جیسے اس شخص کی جس پر موت کی غشی طاری ہو۔۔

3. **تَخَوَّفَ الشَّيْئَ کے معنی ہیں کسی چیز کو کم کر دینا**(تاج). تَخَوَّفَهُ حَقَّهُ اس کے حق کو کم کر دیا۔ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰي تَخَوُّفٍ[16:47]کے معنی ہیں انہیں بتدریج کم کرتا ہوا تباہ کر دے۔ (ڈکشنری آف قرآن)**

لغوی تحقیق: "تخوّف"

- یہ لفظ مادہ **(خ و ف)** سے ہے، یعنی اصل جڑ وہی ہے جو "خوف" کی ہے۔
- **تخوّف** کے معنی:
  1. **آہستہ آہستہ کمی کرنا**، تھوڑا تھوڑا گھٹانا۔
  2. خوف کے باعث کسی چیز کو "کم کر دینا / ہٹانا"۔
  3. ایک طرف سے کاٹ دینا۔

لسان العرب :*التخوّف: التنقّص، أي الأخذ من الشيء قليلاً قليلاً*
"تخوّف کا مطلب ہے کسی چیز کو تھوڑا تھوڑا کر کے گھٹانا، کم کرنا۔"
اسی معنی میں عرب کہا کرتے تھے:
"تخوّفت الريحُ الشيءَ" ← *"*ہوا نے چیز کو تھوڑا تھوڑا کر کے گھٹا دیا۔"

ان تینوں معنوں میں سے پہلی اور دوسری معنیٰ، یعنی "ڈر" و "خطرہ"، تو اللہ کی ذات پر مناسب نہیں آتا، پر اگر تیسری معنیٰ لی جائے یعنی "کم کرنا/گھٹانا" تخفیف کرنا، تو اس آیت کا ترجمہ اس طرح ہوسکتا کہ

"اور وہ ان کی عاقبت میں کمی نہیں کرتا۔" یعنی ان کے عاقبت کے (عذاب) میں بھی کمی نہیں کرتا۔ یعنی اللہ نے انکو دنیا میں تو عذاب کا مزا چکھایا، پر آخرت میں بھی جو انکو عذاب ملیگا، اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔
یہ ترجمہ شک و شبہ کو دور کردیتا ہے۔ پر اس طرح کسی مترجم نے آج تک ترجمہ کیا نہیں۔ اس لیے میں نے بھی فی الحال مجبوراً مشہور قول کو ہی روا رکھا ہے۔۔۔

✎ دوسرا: ہوسکتا یہ ضمیر اللہ کی طرف نہیں، بلکہ اس شخص کی طرف ہے جس نے ناقہ کی کونچیں کاٹی۔ یعنی "اور وہ اس کے انجام سے نہیں ڈرتا؟" یعنی وہ اتنا بڑا گناہ اور نافرمانی کر بیٹھا، کتنا بڑا بدبخت ہے کہ اپنے انجام/عاقبت تک کا کوئی خوف نہیں۔ (واللہ اعلم)

درسِ سورة

✎ تمہارے نفس میں "فجور" و "تقوٰی" ڈال دی گئی ہے، فَأَلۡهَمَهَا فُجُورَهَا وَ تَقۡوٰىهَا ﴿٨﴾، پس اب وہی کامیاب ہوگا، جو اپنے نفس کو پاک کرے گا۔ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا ﴿٩﴾

اس سورة کی بیچ کی آیات اس سورة کا بنیادی درس ہے۔

عملی پیغام

- نفس کی اصلاح ہی فلاح ہے۔
- اجتماعی سرکشی اجتماعی تباہی لاتی ہے۔
- وسائل (پانی وغیرہ) کی ناانصافی قوموں کو برباد کرتی ہے۔
- اللہ کے فیصلے قطعی اور اٹل ہیں۔

⌘ موضوعاتی مائنڈ میپ

کائنات کی قسمیں

← سورج
← چاند
← دن
← رات
← آسمان
← زمین
← نفس

نفس کی حقیقت

← اللہ نے توازن دیا
← خیر و شر کی پہچان دی
← تزکیہ ← کامیابی
← آلودگی ← ناکامی

تاریخی مثال

← قوم ثمود کی سرکشی
← اشقی شخص کا جرم
← اونٹنی کا قتل
← اجتماعی عذاب

اختتامی پیغام

← اللہ کی پکڑ قطعی ہے
← اس کے فیصلے پر کوئی خوف یا مواخذہ نہیں

ابتداء و انتہاء / ناقة الله و يدالله

- قرآن کی اکثر سورتیں کا انداز بیان اس طرح ہوتا ہے کہ انکی ابتداء انکی انتہا سے میچ کرتی ہے۔ (اور اس بات کو ڈاکٹر اسرار احمد نے بھی کسی موقع پر بیان کیا ہے)

- دوسری بات: کہتے ہیں قرآن کا یک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن ہوتا ہے۔ ایک وہ پیغام ہوتا ہے جو الفاظوں میں اظہر ہوتا ہے، اور ایک وہ پیغام ہوتا ہے جو زیادہ باریک اور حکمت کے تحت زیادہ دقیق ہوتا ہے۔

- ظاہری معنی تو ہم پڑھ آئے، پر باطنی طور پر یہاں ایک باریک نقطہ ہے۔ کہ سورہ کہ شروعات میں آیا کہ
 "چاند کی قسم جب اس (سورج) کے پیچھے نکلے"،
پیچھے "تلا" کرے، اور "تلا" کی معنی ہم دیکھ آئے معنٰی "اتباع" کرنا۔ اس طرح اتباع کرنا کہ کوئی غیر بیچ میں حائل نہ ہو۔

- پھر ایک حدیث بھی آگئی کہ سورج سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے، اور چاند سے مراد امام علی علیہ السلام ہیں۔

پھر باریک بینی سے دیکھا جائے تو چاند سورج کی کوئی اتباع نہیں کرتا، چاند تو دراصل زمین کی اتباع کرتا ہے۔ کہ زمین کے گِرد طواف کرتا۔ پھر کیا اس "تلا" سے واقعی حضرت علی کا نبی کریم کے پیچھے چلنا مراد ہے؟

✐ پھر دوسری جانب سورۃ کے آخر میں قوم ثمود کا ذکر ہوتا ہے، انسان کے دماغ میں سوال اٹھتا، قوم ثمود ہی کیوں؟
قومیں تو اور بھی تھیں؟ پر قومِ ثمود ہی کیوں؟ اور پوری سورۃ میں ذکر بھی صرف ایک قوم کا ہے، ایسا کیوں؟

پھر احادیث آگئی، کہ ایک شقی ترین شخص اولین میں سے بھی اٹھا تھا، جس نے "ناقۃ اللہ" کو قتل کردیا۔ اور ایک شقی ترین شخص آخری امت میں سے بھی اٹھے گا (جو دراصل اُسی کی نسل سے ہوگا) اور اللہ کے "ید اللہ" کو قتل کر ڈالے گا۔

باطنی مفہوم کے طور پر ، سورۃ کی ابتداء "والقمرِ اذا تلٰھا"، اپنی انتہاء سے میچ کر جاتی۔

حدیثِ رسول: "جو کچھ پچلی امتوں میں ہوا، اس امت میں بھی لازمی ہوکر رہیگا۔ " (بخاری، 7320)

فَقَالَ لَهُمۡ رَسُولُ ٱللَّهِ نَاقَةَ ٱللَّهِ وَسُقۡيَٰهَا ۱۳
اللہ کے رسول نے ان سے کہا، اللہ کے ناقہ اور اس کے پانی پلانے (کا خیال رکھنا)

✐ اولین کی بات تو واضح ہے، پر آخرین میں سے آیت کی تطبیق کیسے ہو؟

ممکن ہے کچھ اس طرح کہ: رسول اللہ ﷺ نے کہا اپنی امت سے کہ دیکھو "اللہ کے اس ناقہ"، میرے بھائی، میرے وصی، میرے جانشین کا خیال رکھنا، اور اسکے ساتھ ساتھ اسکے "پانی پلانے" کا بھی خیال رکھنا۔ یعنی اس کے "حقِ وصایت، و حقِ ولایت، وحقِ جانشینی، و حقِ خلافت" کا خیال رکھنا۔ اسکی کونچیں مت کاٹ ڈالنا، اور نہ اس کے حقوق کو لوٹ کر آپس میں مل بانٹ کر لوٹ لینا۔ جیسے ناقۃ اللہ کو ذبح کرکے قوم ثمود نے اس کے گوشت کے ٹکڑے کر کے لے گئی، اور آپس میں بانٹ لیا (ناقۃ صالح کا ذکر سورہ اعراف کی آیت 77 کے ضمس میں تفصیل سے ہے)....

اور دیکھو، اسکے بال بچوں / اولاد کا بھی خیال کرنا۔ عجیب اتفاق ہے کہ ناقۃ اللہ کے قصے میں بھی اونٹنی اپنے بچے کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔ اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ کربلا میں امام حسین علیہ السلام پر بھی "پانی" بند کردیا گیا تھا۔ یعنی آیت کو اب دوبارہ پڑھیں۔ رسول اللہﷺ کہتے ہیں دیکھو اس "ناقۃ اللہ" کا خیال کرنا اور اس کے پانی پلانے کا بھی خیال کرنا۔ (واللہ اعلم)

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ

اظهر حسین ابڑو (اللهم اغفر له وارحمه)

2021

Re-Modified

7-جولاء-2023

14 ذوالحج 1444

Re-re-modified

20-June-2025